مسلکِ اعتدال

کسی مسلمان کو اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امورِ دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل واجب الاتباع ہے اور قرآن کے بعد جس چیز کے ذریعہ سے ہم کو اپنے دین کا علم حاصل ہوتا ہے وہ حضور کا طریقہ ہی ہے۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ طریقِ نبوی کے علم کی کیا کیا صورتیں ہیں اور کس صورت کا دین میں کیا مرتبہ ہے۔

جو باتیں حضورؐ سے ہم تک پہنچی ہیں ان کو دو حصّوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصّہ ہے جو تواتر کے ساتھ آیا ہے، خواہ وہ تواترِ عملی ہو یا خبری دوسرا حصہ وہ ہے جو تواتر کے ساتھ نہیں آیا۔ ان میں سے پہلے حصّہ کے متعلق تمام امت کا اتفاق ہے کہ وہ یقینی ہے اور عقل بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے ثابت شدہ حقیقت تسلیم کرنا چاہیے، کیونکہ تواتر کا مفید یقین ہونا مسلمات میں سے ہے۔ رہا دوسرا حصّہ تو اصولاً اس کو سب ظنی مانتے ہیں۔ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ مفید علم ضروری ہے۔ مگر اختلاف جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ اس اصولی ظنیت کی بنا پر اخبارِ احاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ اس مسئلہ میں تین مختلف مسلک ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ احادیث کا تمام مجموعہ ظنی ہے، اس لیے وہ من حیث الکل رد کر دینے کے لائق ہے، کیونکہ جو چیز ظنی ہے وہ ثابت شدہ نہیں اور جو ثابت شدہ نہیں وہ لائقِ اتباع نہیں۔ مگر تھوڑے سے غور و خوض کے بعد اس مسلک کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی مظنون چیز ثابت شدہ

نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا ثابت شدہ نہ ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ وہ رد ہی کر دینے کے قابل ہو؟ اگر اتباع کے لیے یقینی ہونا شرط ہے تو فرمائیے کہ "یقینیات" دنیا میں ہیں کتنے؟ آپ کی زندگی کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں آپ صرف یقینیات کی پیروی کرتے ہیں اور مظنونات کو من حیث الکل رد کر دیتے ہیں؟ تجزیہ و تحلیل کے چند ہی مدارج طے کر کے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ قاعدہ زندگی میں نہ کبھی چلا ہے نہ چل سکتا ہے۔ مظنونات کو من حیث الکل قبول کر لینا جس درجہ کی غلطی ہے، اسی درجہ کی غلطی ان کو من حیث الکل رد کر دینا بھی ہے۔ عقلِ سلیم کا اقتضا یہ ہے اور اسی کی پیروی زندگی کے تمام معاملات میں انسان کرتا ہے کہ تمام مظنونات کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے بلکہ ان کے درمیان تمیز کی جائے۔ ان میں سے ہر ایک کو جدا جدا جانچ کر دیکھا جائے اور تحقیق کے مختلف ذرائع سے کام لے کر یہ دریافت کیا جائے کہ کونسی چیز یقین سے کس درجہ قریب یا کس درجہ بعید ہے۔ جو چیز بعید ہو اسے رد کر دو۔ جو چیز قرب و بعد کے درمیان ہو اس میں توقف کرو۔ اور جو چیز قریب یا اقرب ہو اس کو بلحاظ اس کے درجہ کے قبول کر لو۔ یہی اصول ہے جس پر دنیا کے سارے معاملات میں عمل کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ ہمارا دین غیر معقول نہیں ہے اس لیے اسی کی پیروی دین کے معاملات میں بھی کرنی چاہیے۔

کم از کم ہمیں تو قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جو اس اصول کو خلافِ حق قرار دیتی ہو۔ جن آیات میں ظن پر چلنے والوں کی بُرائی وارد ہوئی ہے ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ظن کوئی گناہ ہے یا اس سے بالکلیہ اجتناب واجب ہے، بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ جو ظن و تخمین وحی کے خلاف ہو، یا جس کو وحی سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر اختیار کیا جائے، وہ گمراہی کا سبب ہے۔

احادیث کو بالکلیہ رد کر دینے سے عملاً جو خرابی واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جزئیات میں انسان رسالت کی رہنمائی سے محروم ہو جاتا ہے، اور دین پر عمل کرنے کی تفصیلی صورتوں میں قیاس و رائے کا دخل اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ

اس سے اصولی احکام کی اصلی اسپرٹ کے بھی غائب ہو جانے کا خوف ہے۔ نیز اس میں یہ بھی خطرہ ہے کہ جب تفصیلات میں سرے سے کوئی سند ہی نہ ہوگی تو لامحالہ انفرادیت راہ پائے گی۔ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے رجحان کے مطابق جو صورت چاہے گا اختیار کرے گا، اور کوئی قوت ایسی باقی نہ رہے گی جو تفرقہ و انتشار اور اختلافِ عمل کو انفرادیت کی آخری حدود تک پہنچنے سے روک سکتی ہو۔

مثال کے طور پر ایک نمازِ جمعہ ہی کو لیجیے۔ ہمارے پاس علم یقین کے جو ذرائع ہیں ان میں سے پہلا اور سب سے بڑا ذریعہ یعنی قرآن ہم کو صرف یہ ہدایت دیتا ہے کہ "جب نمازِ جمعہ کے لیے بلایا جائے تو سب کام چھوڑ کر دوڑ پڑو"۔ دوسرا ذریعہ یعنی عمل متواتر ہم کو اس سے تھوڑی دُور آگے لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ صرف اتنا علم ہم کو دیتا ہے کہ جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے، اس کے لیے جماعت شرط ہے، اس سے پہلے خطبہ ہونا چاہیے، اس کی رکعتیں دو ہیں، اور اس کے لیے اذنِ عام ضروری ہے۔ ان امور کے بعد جتنے عملی جزئیات ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن یا عمل متواتر سے ہم کو معلوم نہیں ہوتی۔ اب اگر اخبارِ احاد کو بہ حیثیت مجموعی رد کر دینے کا اصول اختیار کیا جائے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص جزئیات کو اپنی رائے سے مقرر کریگا، اور کسی رائے کو بھی کوئی ایسی قوت حاصل نہ ہوگی جس کی بنا پر اسے دوسری رائے کے مقابلہ میں ترجیح دی جا سکے اور مسلمانوں کی کسی بڑی جماعت پر اس کی پیروی لازم ہو جائے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سے جزئیات میں کتنی افراتفری برپا ہوگی، نظامِ جماعت کو کتنا نقصان پہنچے گا اور کس طرح بعض صورتوں میں مقاصدِ شریعت تک فوت ہو جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اخبارِ احاد سے جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ مختلف ہیں اور ان کی بنا پر بھی متعدد مذہب نکلتے ہیں مگر اول تو ان میں بمشکل پانچ سات مذاہب نکلنے کی گنجائش ہے اور پھر ان سے جتنے مذہب بھی نکلتے ہیں ان سب کے لیے ایک با اعتبار اعتقاد کی سند حاصل ہے جس کو سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں اور جس کی قوت سے

مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس کا اتباع کرتی ہے بخلاف اس کے اخبار احاد کو بالکلیہ رد کر دینے کے بعد بے شمار مذاہب کی گنجائش نکل آتی ہے اور ان میں سے کسی مذہب کو بھی کوئی ایسی سند حاصل نہیں ہوتی جو زیادہ نہیں وہ بھی مسلمانوں کو ایک جزئیہ میں ایک طریقہ پر جمع کر دے۔ نتیجہ اس کا بالکل ظاہر ہے۔ جمعہ کی قوتِ جامعہ ختم ہو کر رہ جائے گی، اختلافِ عمل اس مقصد ہی کا خاتمہ کر دے گا جس کے لیے اقامتِ جمعہ فرض کی گئی ہے۔

جمعہ کو ہم نے صرف مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ ورنہ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے نظامِ شرعی کو جو چیز ایک مستقل عملی نظام بناتی ہے اور جو چیز مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست غرض ان کی پوری اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ کو ایک مستقل تفصیلی شکل میں ڈھالتی ہے وہ وہی علم ہے جو ہم کو اخبار احاد سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی، آپ کے اخلاق، آپ کی عادات، آپ کا طریقِ عبادت، آپ کا طرزِ تعلیم و تبلیغ، آپ کا طرزِ عدالت، آپ کے قانونی فیصلے، زندگی کے مختلف شعبوں میں آپ کی ہدایات اور آپ کا طرزِ عمل، پھر آپ کے خلفاء اور صحابہ اور اہل بیت اور تابعین کے آثار یہی وہ چیزیں ہیں جو اسلام کی عملی زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتی ہیں اور اسی نقشہ پر اسلام ایک مکمل نظامِ حیات بنتا ہے۔ مگر ان چیزوں کے حصول کا ذریعہ نہ قرآن ہے نہ تواتر۔ صرف اخبار احاد ہی ہیں جو ہم تک معلومات اور ہدایات کا یہ عظیم الشان ذخیرہ پہنچاتی ہیں۔ ان کو مٹا دیجیے پھر اسلام محض ایک ڈھانچہ رہ جائے گا جس پر گوشت پوست کچھ نہ ہوگا جس کی شکل اور جس کے خدوخال کو جو شخص جس طرح چاہے گا بنائے گا۔ اس صورت میں درحقیقت کوئی ایک نظامِ جماعت قائم ہی نہ ہو سکے گا، کجا کہ کوئی ایسی تہذیب وجود میں آسکے جو اسلامی تہذیب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی مخالفت آج وہی لوگ کر رہے ہیں جو دراصل اسلامی تہذیب کے نظام کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے تعینات کی

حدود میں اپنی اہواء اور خواہشات کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش نہیں پاتے، اس لیے انہوں نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ اس چیز کو ہی مٹا دو جو اس نظام کی حد بندی کرتی ہے، پھر ہم آزاد ہو جائیں گے کہ اسلام کے ڈھانچے پر جس طرح چاہیں گوشت پوشت چڑھائیں اور جیسی چاہیں اس کی شکل بنا دیں۔

یہ لوگ احادیث کو مجموعی حیثیت سے مردود قرار دینے کے لیے ان حدیثوں کو مثال میں پیش کرتے ہیں جو باہم متعارض ہیں، یا جن میں انبیاء علیہم السلام پر طعن پایا جاتا ہے، یا جو صریح عقل کے خلاف ہیں، یا قرآن کے خلاف نظر آتی ہیں۔ ان چند افراد سے یہ لوگ پورے مجموعہ کے غلط اور قابلِ رد ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کسی قوم کے چند افراد کی بدمعاشی سے پوری قوم کی بدمعاشی پر استدلال کیا جائے۔ جب ہر روایت بلحاظ متن اور بلحاظ اسناد دوسری روایت سے مختلف ہے تو ہر روایت کے متعلق جدا جدا تحقیق کر کے رائے قائم کرنی چاہیے کہ وہ قبول کرنے کے لائق ہے یا رد کر دینے کے لائق۔ سب کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے لے کر پورے مجموعے کے متعلق ایک ہی رائے قائم کر لینا کسی معقول انسان کا فعل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ لوگ احادیث پر فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے تو ان کو معلوم ہو گا کہ جہاں ایک قلیل تعداد ایسی حدیثوں کی ہے جنہیں دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ حدیثیں رسول اللہ کی نہیں ہو سکتیں، وہاں ایک کثیر تعداد ایسی حدیثوں کی بھی ہے جو حکمت کے جواہر سے لبریز ہیں، جن میں قانون اور اخلاق کے بہترین اصول پائے جاتے ہیں، جو اسلام کی حقیقت اور اس کے مصالح و حکم پر بہترین روشنی ڈالتی ہیں اور جن کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ایک رسول ہی کی حدیثیں ہو سکتی ہیں۔ پھر اگر یہ لوگ حق پرست اور انصاف پسند ہوں تو انہیں نظر آئے کہ محدثین کرام نے عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ کے آثار و اخبار جمع کرنے اور ان کو چھانٹنے اور ان کی حفاظت کرنے میں وہ محنتیں کی ہیں جو دنیا کے کسی گروہ نے

کسی دور کے حالات کے لیے نہیں کیں۔ انہوں نے احادیث کی تنقید و تنقیح کے لیے جو طریقے اختیار کیے وہ ایسے ہیں کہ کسی دور گذشتہ کے حالات کی تحقیق کے ان سے بہتر طریقے عقلِ انسانی نے آج تک دریافت نہیں کیے۔ تحقیق کے زیادہ سے زیادہ معتبر ذرائع جو انسان کے امکان میں ہیں وہ سب اس گروہ نے استعمال کیے ہیں اور ایسی سختی کے ساتھ استعمال کیے ہیں کہ کسی دورِ تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ درحقیقت یہی چیز اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ اس عظیم الشان خدمت میں اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق شاملِ حال رہی ہے، اور جس خدا نے اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا ہے اسی نے اپنے آخری نبی کے نقوشِ قدم اور آثارِ ہدایت کی حفاظت کے لیے بھی وہ انتظام کیا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

یہ تو اس گروہ کے متعلق تھا جو احادیث کی اصولی ظنیت کی بنا پر انہیں بالکلیہ رد کر دینا چاہتا ہے۔ اب دوسرے گروہ کو لیجیے جو دوسری انتہا کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابلِ اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابلِ اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیئے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں۔ جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں۔ ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں۔ رواۃ کے عدل اور ضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کر گئے ہیں ان پر گویا ایمان لے آئیں۔ ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے، ٹھیک اسی معیار کی ہم

بھی پابندی کریں۔ مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر، مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں اور ان کی کھینچی ہوئی حد سے یک سرِ مُو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی شدت نے بہت سے کم علم لوگوں کو حدیث کی کلی مخالفت یعنی دوسری انتہا کی طرف دھکیل دیا ہے۔

محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلّم۔ یہ بھی مسلّم کہ نقدِ حدیث کے لیے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدرِ اوّل کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظن غالب ان کو جس بنا پر حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا، اس لیے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے کمالات کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انہوں نے کی ہے اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد اور دوسرے بلحاظ تفقہ۔

اس مطلب کی توضیح کے لیے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے۔

کسی روایت کے جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔ اس سلسلہ

میں متعدد حیثیات سے ایک ایک راوی کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ جھوٹا تو نہیں؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور بدعقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال ہے یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے رواۃ کے احوال کی جانچ پڑتال کر کے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو؟ اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظہ اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل، دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے۔ نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا، اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکان عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آگیا ہے۔ حماد جیسے بزرگ تمام علمائے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ "ان کے پاس علم نہیں، تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں"۔ عطا اور طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں ان کی یہی رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابوحنیفہ کے استاد اور ابراہیم النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھیے۔ اپنے زمانہ کے اہل مکہ پر ریمارک کرتے ہیں مَا رَأَيْتُ أَنْقَصَ لِعَرَى الْإِسْلَامِ مِنْ أَهْلِ مَكَّةَ حالانکہ مکہ اس وقت جلیل القدر علماء و صلحاء سے خالی نہ تھا۔ شعبی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجہ کے لوگ ہیں۔ مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ "ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے"۔ ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ "وہ کذاب مسروق سے روایت کرتا ہے حالانکہ وہ مسروق سے ملا تک نہیں"۔ ضحاک کو دیکھیے۔ ایک مرتبہ اپنی بات کی پچ میں آکر صحابہ کرام کے متعلق کہہ گئے کہ "ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں"۔ سعید بن جبیر جیسے محتاط بزرگ ایک مسئلہ میں شعبی پر جھوٹ کا

الزام رکھتے ہیں اور عکرمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ لَا تَكْذِبْ عَلَيَّ كَمَا كَذَبَ عِكْرِمَةُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ۔ امام مالک کی جلالت شان دیکھیے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمانا دیکھیے کہ ذَالِكَ دَجَّالٌ الدَّجَاجِلَةِ۔ اس سے بڑھ کر عجیب یہ کہ وہ تمام علمائے عراق پر سخت طعن کرتے ہیں اور ان کے حق میں فرماتے ہیں کہ اَنْزِلُوْهُمْ مَنْزِلَةَ اَهْلِ الْكِتَابِ لَا تُصَدِّقُوْهُمْ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ۔
امام ابو حنیفہ کس قدر جلیل القدر اور محتاط فقیہ ہیں، اعمش کے حق میں فرماتے ہیں کہ اس نے کبھی نہ رمضان کا روزہ رکھا نہ غسلِ جنابت کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ کے قائل تھے اور حذیفہ کی حدیث کے مطابق سحری کیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن مبارک کس پایہ کے ثقہ بزرگ ہیں، ایک مرتبہ ان پر بھی ضد نے غلبہ کیا اور امام مالک کے حق میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "میں اس کو عالم نہیں سمجھتا"۔ یحییٰ بن معین نے تو بڑے بڑے ثقات پر چوٹیں کی ہیں۔ زہری، اوزاعی، ابو عثمان النہدی، طاؤس غرض اس عہد کے بڑے بڑے لوگوں پر وہ طعن کر گئے ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعی تک کے حق میں انہوں نے کہا کہ لَيْسَ بِثِقَةٍ۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریاں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ابن عمرؓ نے سنا کہ ابو ہریرہؓ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے کہ ابو ہریرہؓ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہ نے ایک موقع پر انس اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیثِ رسول اللہ کو کیا جانیں، وہ تو اس زمانہ میں بچے تھے۔ حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ شَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ کے معنی پوچھے گئے۔ انہوں نے اس کی تفسیر بیان کی۔ عرض کیا گیا کہ ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیا۔ عبادہ بن صامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا، حالانکہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں[1]۔

---

[1] یہ تمام مثالیں علامہ ابن عبدالبر کی کتاب جامع بیان العلم سے ماخوذ ہیں۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو، اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھیرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظہ اور اس کی نیک نیتی اور صحتِ ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو اور بھی مشکل ہے، اور ان سب سے زیادہ مشکل یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے ہر روایت کے بیان میں ان تمام جزئیاتِ متعلقہ کو ملحوظ بھی رکھا ہے یا نہیں جو فقیہانہ نقطۂ نظر سے استنباطِ مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ تو فنِ رجال کا معاملہ ہے۔ اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلۂ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے آیا وہ اس کا ہم عصر تھا یا نہیں، ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں، اور ملا تھا تو آیا اس نے یہ خاص حدیث خود اسی سے سنی یا کسی اور سے سُن لی اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں کی تحقیق انہوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے، مگر لازم نہیں کہ ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مرسل یا معضل یا منقطع ہیں، اور اس بنا پر پایۂ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں، ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے

علم کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے، مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، محدثین رحمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنا تھا۔ اس لیے ان پر اخباری نقطۂ نظر غالب ہو گیا تھا، اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں زیادہ تر صرف اسی چیز کا لحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں، رہا فقیہانہ نقطۂ نظر (یعنی متنِ حدیث پر غور کر کے یہ رائے قائم کرنا کہ وہ قابلِ قبول ہے یا نہیں؟) تو وہ ان کے موضوعِ خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر ہوا ہے کہ ایک روایت کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے، حالانکہ معنی کے اعتبار سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالانکہ معنیً وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ مثالیں دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو کی توضیح کی جائے۔ مگر جو لوگ امورِ شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر بکثرت مواقع پر فقیہانہ نقطۂ نظر سے ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ توازن و اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہائے مجتہدین نے رکھا ہے۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس طرح حدیث کو بالکلیہ رد کر دینے والے غلطی پر ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی سے محفوظ نہیں ہیں جنہوں نے حدیث سے استفادہ کرنے میں صرف روایات ہی پر اعتماد کر لیا ہے۔ مسلکِ حق ان دونوں کے درمیان ہے اور یہ وہی مسلک ہے جو ائمۂ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں جو مرسل اور معضل اور

منقطع احادیث پر مبنی ہیں، یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے، یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ یہی حال امام مالک کا ہے باوجودیکہ اخباری نقطۂ نظر ان پر زیادہ غالب ہے، مگر پھر بھی ان کے تفقہ نے بہت سے مسائل میں ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتویٰ دینے پر مجبور کر دیا جنہیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں، چنانچہ لیث بن سعد نے ان کی فقہ سے تقریباً ۷۰ مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں۔ امام شافعی کا حال بھی اس سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ معاذاللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ کسی حدیث کو صحیح جان کر اس سے انحراف کرتے تھے۔ نہیں، بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحتِ حدیث کا مدار صرف اسناد پر نہ تھا، بلکہ اسناد کے علاوہ ایک اور کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے، اور جس حدیث کے متعلق ان کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے اسی کو قبول کر لیتے تھے خواہ وہ خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دوسری کسوٹی کونسی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیت مجموعی شریعتِ حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا

ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبوی کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے، اور کونسی چیز سنتِ نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں ان کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لیے کہ اس کی روح روحِ محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے، مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لیے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معقل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے، اس لیے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

یہ چیز چونکہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے، اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ چنانچہ اسی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان جزئیات میں بکثرت اختلافات ہوتے ہیں۔ پھر یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک شخص کا ذوق لامحالہ دوسرے شخص کے ذوق سے کلیتہً مطابق ہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسلک کے

ائمہ نے بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے اقوال میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اس کی ایک روشن مثال ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مجتہد کا ذوق ہر مسئلہ میں صواب ہی کو پہنچ جائے۔ انسان بہرحال کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کر سکتا ہے اور کر جاتا ہے۔ اسی بنا پر ائمہ مجتہدین ہمیشہ ڈرتے رہے ہیں، اور انہوں نے ہمیشہ اپنے متبعین کو ہدایت کی ہے کہ ہم پر بالکل اعتماد نہ کرو۔ خود بھی تحقیق کرتے رہو اور جب کوئی سنت ہمارے قول کے خلاف ثابت ہو جائے تو ہمارے قول کو رد کر کے سنت کی پیروی کرو۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ یَّقُوْلَ مُقَالَتَنَا حَتّٰی یَعْلَمَ مِنْ اَیْنَ قُلْنَا[1]۔ امام زفر کا قول ہے اِنَّمَا نَاْخُذُ بِالرَّاْیِ مَالَمْ نَجِدِ الْاَثَرَ فَاِذَا جَاءَ الْاَثَرُ تَرَکْنَا الرَّاْیَ وَاَخَذْنَا بِالْاَثَرِ[2]۔ امام مالک کا ارشاد ہے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اُخْطِیُٔ وَاُصِیْبُ فَانْظُرُوْا فِیْ رَاْیِیْ فَکُلُّمَا وَافَقَ الْکِتَابَ وَالسُّنَّۃَ فَخُذُوْہُ وَکُلُّمَا لَمْ یُوَافِقِ الْکِتَابَ وَالسُّنَّۃَ فَاتْرُکُوْہُ[3]۔ امام شافعی کا بیان ہے کہ اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَاضْرِبُوْا بِقَوْلِیْ الْحَائِطَ[4] اور لَا قَوْلَ لِاَحَدٍ مَعَ سُنَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ[5]۔ غرض یہ کہ تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جس شخص پر کسی مسئلہ

---

[1] کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک کہ وہ تحقیق نہ کرلے کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے۔

[2] جب ہم کو کوئی حدیث نہیں ملتی تو ہم اپنی رائے سے فیصلہ کرتے ہیں جب حدیث مل جاتی ہے تو رائے کو چھوڑ کر حدیث کو لے لیتے ہیں۔

[3] میں ایک انسان ہوں غلطی بھی کرتا ہوں اور صحیح رائے بھی قائم کرتا ہوں۔ لہٰذا تم میری رائے کو نظر تحقیق سے دیکھو۔ جو کچھ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے لو اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دو۔

[4] جب حدیث صحیح تمہیں مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔

[5] سنت رسول کے مقابلے میں کسی کو کچھ کہنے کا حق نہیں۔

میں سنتِ رسول روشن ہو جائے اس کے لیے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔

(ترجمان القرآن صفحہ ۵۶مد۔ مئی ۳۷ء)

استدراک:- اس مضمون کی اشاعت کے بعد اہلِ حدیث حضرات کی طرف سے اس پر جو اعتراضات ہوئے ہیں، اور ان پر میری طرف سے جو جوابات دیئے گئے ہیں ان کو یہاں نقل کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ایک اہلحدیث دوست کے سوالات:-

اَ۔ مسلمانوں کا چاروں فقہوں کو ماننا کس نص کے ماتحت ہے؟

ب۔ اسنادِ حدیث اور تفقہ مجتہدین میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے؟

ج۔ تفقہ مجتہد اور اسنادِ حدیث میں سے کس میں زیادہ ظنیت ہے؟

د۔ محدّث اور فقیہ ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور اسے بڑے محدّث یا بڑے فقیہ پر فضیلت ہے یا نہیں؟

ذ۔ کوئی نظیر بتائیں کہ امام ابو حنیفہ نے متن کو ملحوظ رکھ کر ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا اور قوی الاسناد حدیث کو چھوڑا ہو۔

س۔ کیا یہ قولِ ائمہ کہ ان کے فیصلوں کے مقابلہ میں قوی الاسناد حدیث ہی قابلِ قبول ہے صحیح ہے؟

ص۔ درایت کا معیار کیا ہے کہ اسے سامنے رکھ کر اسنادِ صحیح رکھنے کے باوجود حدیث قوی الاسناد کو رد کر دیا جائے؟ نیز بتایا جائے کہ کس نص نے یہ شرط درایت اور اس کا معیار قائم کیا ہے؟

ط۔ کیا کسی مسلمان کو یہ حق ہے کہ خدا اور رسول کا حکم ظن غالب کے بموجب اسے پہنچے اور اس میں درایت کی مداخلت کر کے اس سے گریز کرے

اور اپنے تفقہ کی بنا پر اس کی مخالفت کرے، جبکہ اس کے تفقہ میں بھی خطا کا امکان ہے؟

جواب:- ا۔ چاروں فقہوں کو برحق ماننا کسی نص کے ماتحت نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ چار فقہی مذاہب کتاب وسنت سے استنباط کرنے کے ان اصولوں کو اختیار کرتے ہیں جن کے لیے شریعت میں گنجائش اور بنیاد موجود ہے۔ چاہے جزئی امور میں ان کے درمیان کتنا ہی اختلاف ہو اور جزئی امور میں ان سے اختلاف کرنے کے لیے کتنے ہی معقول وجوہ موجود ہوں، لیکن اصولاً استنباط احکام کے وہی طریقے ان مذاہب میں استعمال کیے گئے ہیں جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور جن سے خود صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے استنباطِ مسائل میں کام لیا تھا۔

ب:- اسناد حدیث اور تفقہ مجتہد میں سے کسی کو کسی پر مطلقاً تفوق نہیں دیا جاسکتا۔ اسناد حدیث اس بات کی ایک شہادت ہے کہ جو روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو پہنچ رہی ہے، وہ کہاں تک قابلِ اعتبار ہے۔ اور تفقہ مجتہد ایک ایسے شخص کی تحقیقی رائے (RESEARCH) ہے جو کتاب وسنت میں گہری بصیرت رکھنے کے بعد ایک رپورٹ کے متعلق اندازہ کرتا ہے کہ وہ کہاں تک قابلِ قبول ہے اور کہاں تک نہیں، یا اس رپورٹ سے جو معنی اخذ ہوتے ہیں وہ نظامِ شریعت میں کہاں تک نصب (FIT) ہو سکتے ہیں اور کہاں تک غیر متناسب (UNFIT) ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح عدالت میں شہادتیں اور جج کا فیصلہ دونوں کی الگ حیثیت ہے، یعنی نہ مطلقاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جج کا فیصلہ شہادتوں پر بہرحال مقدم ہے اور نہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ شہادتیں ضرور جج کے فیصلہ پر مقدم ہوتی ہیں، اسی طرح محدث کی شہادت اور فقیہ کی اجتہادی تحقیق، دونوں میں سے کسی کو بھی مطلقاً دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

ج ۔ تفقہ مجتہد میں بھی خطا کا امکان ہے اور اسنادِ حدیث میں بھی۔ پس میرے نزدیک لازم ہے کہ ایک ذی علم آدمی مجتہدین کے اجتہاد اور احادیث کی روایات دونوں میں نظر کرکے حکم شرعی کی تحقیق کرے۔ رہے وہ لوگ جو حکم شرعی کی خود تحقیق نہیں کر سکتے تو ان کے لیے یہ بھی صحیح ہے کہ کسی عالم کے اوپر اعتماد کریں اور یہ بھی صحیح ہے کہ جو مستند حدیث مل جائے اس پر عمل کریں۔

د ۔ ایک آدمی بیک وقت محدث اور فقیہ ہو سکتا ہے اور ایسا شخص محض محدث یا نرے فقیہ کے مقابلہ میں اصولاً قابلِ ترجیح ہے۔ لیکن میرا جواب صرف اصولی حیثیت سے ہے۔ کسی شخصِ خاص پر اس کا انطباق کرنے میں لازماً یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا تفقہ میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو حفظِ حدیث میں ہے۔

س ۔ اس وقت میرے پیشِ نظر مطلوبہ نظیر نہیں ہے، اور ویسے بھی نظیریں پیش کرنے سے بحث کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔

ص ۔ ائمۂ مجتہدین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات صحیح الاسناد حدیث متن کے اعتبار سے کمزور پہلو رکھتی ہے اور کتاب و سنت سے جو دوسری معلومات ہم کو حاصل ہوتی ہیں ان کے ساتھ اس کا متن مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے حالات میں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا اس حدیث کی تاویل کی جائے اور یا اسے رد کیا جائے۔

ض ۔ درایت سے مراد فہمِ دین ہے جس کو قرآن مجید میں "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ حکمت شریعت کی صحیح پیروی کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جو درجہ "حذاقت" کا فنِ طب میں ہے۔ جن لوگوں نے اس میں سے کم حصہ پایا ہو یا جنہیں اس کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہ ہو ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ جیسا لکھا پائیں ویسا ہی عمل کریں۔ لیکن جنہیں اس میں سے کچھ حصہ ملا ہو وہ اگر اس بصیرت سے جو انہیں اللہ کے فضل سے کتاب و سنت میں حاصل ہوئی ہو، کام نہ لیں تو

میرے نزدیک گنہگار ہوں گے۔

میرے نزدیک کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے میں آپ کو حکمت اور فقہ اور فہم دین کا کوئی ایسا معیار بتا سکوں جس پر آپ ناپ تول کر دیکھ لیں کہ کسی نے ان میں سے حصہ پایا ہے یا نہیں اور پایا ہے تو کتنا پایا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے طبیب کی حذاقت کا جوہری کی جوہر شناسی کا اور کسی صاحب فن کی فنی مہارت کا کوئی ناپا تلا معیار نہیں قائم کیا جا سکتا۔ مگر اس چیز کے حدود معین نہ کیے جا سکنے کا معنی یہ نہیں ہے کہ یہ چیز سرے سے لاشے ہے یا شریعت میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

ط۔ اس سوال کا جواب اوپر کے جوابات میں ضمناً ہے۔ صرف اتنا اور کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ درایت کے استعمال میں خطا کا امکان ہے۔ لیکن ایسا ہی امکان کسی حدیث کو صحیح اور کسی کو ضعیف اور کسی کو موضوع قرار دینے میں بھی ہے۔ اگر کوئی مسلمان درایت کے استعمال میں غلطی کر کے مجرم ہو جاتا ہے تو وہ احادیث کے مرتبہ کا تعین کرنے میں بھی غلطی کر کے ویسا ہی مجرم ہوگا۔ لیکن شریعت انسان کی استعداد اور اس کے ممکنات کی حد تک ہی اس پر بار ڈالتی ہے اور اسی حد تک اسے مسئول قرار دیتی ہے۔

ایک دوسرے اہلحدیث دوست کا عنایت نامہ:۔

"فقہی جزئیات کی تعمیل میں کتاب وسنت کے ماتحت مختلف ہونا الگ معاملہ ہے اور اسے برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن اصولی طور پر روایتِ نبوی اور درایتِ مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا ناقابلِ برداشت ہے، بلکہ بعض حالات میں یہ معاملہ انکارِ حدیث کا مترادف ہو سکتا ہے۔ خود اکابرِ حنفیہ بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ نیز امام ابوحنیفہؒ نے بھی اس قسم کے عقیدہ و خیال سے تبرّی اور بیزاری ظاہر کی ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ اور شامی۔"

جواب :- آپ کا یہ فقرہ کہ "اصولی طور پر روایتِ نبوی اور درایتِ مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا" یقیناً میرے مسلک کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ اور پھر آپ کا یہ ارشاد کہ "بعض حالات میں یہ معاملہ انکارِ حدیث کا مترادف ہو سکتا ہے" بے انصافی کی حد تک جا پہنچتا ہے۔ آپ خود ہی انصاف سے غور فرمائیں کہ اسی کتاب میں حدیث کے متعلق میں نے جو مضامین لکھے ہیں اور دوسری کتابوں اور مضامین میں جس طرح میں حدیث سے استدلال و احتجاج کرتا رہا ہوں، کیا ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد میرے متعلق یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے کہ میرا ذرہ برابر بھی کوئی میلان منکرینِ حدیث کے مسلک کی طرف ہے یا ہو سکتا ہے؟ پھر اگر آپ مجھے مومن و مسلم سمجھتے ہیں تو آخر کس طرح آپ نے یہ گمان کر لیا کہ میں کسی روایت کو فی الحقیقت حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مان لینے کے بعد پھر اس پر کسی کے تفقہ یا اپنے اجتہاد یا کسی امام کے قول کو ترجیح دے سکتا ہوں؟ ترجیح تو درکنار اگر میں دونوں کو مساوی بھی سمجھوں، بلکہ اس کا خیال بھی کروں تو مومن کیسے رہ جاؤں گا؟

دراصل آپ لوگ جس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ یہی ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اجتہاد و تفقہ کو حدیثِ رسول پر ترجیح دیتے ہیں یا دونوں کو ہم پلہ قرار دیتے ہیں حالانکہ اصل واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک اسناد کی صحت حدیث کی صحت معلوم کرنے کا ایک ہی ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان ذرائع میں سے ایک ہے جن سے کسی روایت کے حدیثِ رسول ہونے کا ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم متن پر غور کرتا، قرآن و حدیث

کے مجموعی علم سے دین کا جو فہم ہمیں حاصل ہوا ہے، اس کا لحاظ کرنا، اور حدیث کی وہ مخصوص روایت جس معاملہ سے متعلق ہے اس معاملہ میں قوی تر ذرائع سے جو سنت ثابتہ ہمیں معلوم ہو اس پر نظر ڈالنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں اور بھی متعدد پہلو ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر ہم کسی حدیث کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دینا درست نہیں سمجھتے۔ پس ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ حدیثِ رسول اور اجتہادِ مجتہد میں مساوات ہے یا نہیں بلکہ اختلاف دراصل اس امر میں ہے کہ روایات کے ردّ و قبول اور ان سے احکام کے استنباط میں ایک محدث کی رائے بلحاظ سند اور ایک مجتہد کی رائے بلحاظ درایت کا مرتبہ مساوی ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ دونوں میں سے کس کی رائے زیادہ وزنی ہے؟ اس باب میں اگر کوئی شخص دونوں کو ہم پلہ قرار دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اگر دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ لیکن آپ لوگ اس کو گنہگار بنانے کے لیے اس پر خواہ مخواہ یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ وہ حدیث کو حدیثِ رسول مان لینے کے بعد پھر کسی مجتہد کی رائے کو اس کا ہم پلہ یا اس پر قابلِ ترجیح قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اس چیز کا تصور بھی کسی مومن کے قلب میں جگہ نہیں پا سکتا۔

محدثین جن بنیادوں پر احادیث کے صحیح یا غلط یا ضعیف وغیرہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں ان کے اندر کمزوری کے مختلف پہلوؤں میں بیان کر چکا ہوں۔ آپ براہِ کرم مجھے بتائیے کہ فی الواقع کمزوری کے وہ پہلو فنِ حدیث میں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہیں تو پھر آخر آپ حضرات ہم سے محدثین کی آرا پر ایمان لے آنے کا مطالبہ کیوں اس شد و مد سے کرتے ہیں؟ محدثین کو بالکل ناقابلِ اعتبار تو ہم نے کہا نہیں، نہ کبھی ہم اس کا خیال بھی دل میں لا سکتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس حدیث کی تحقیق میں سب سے پہلے ہم یہی دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے اس کا کیا حال ہے، اور اس معاملہ میں جس پایہ کے محدث نے اس کو اپنی

کتاب میں جگہ دی ہو اس کے مرتبہ کے لحاظ سے ہم اس کی رائے کو پوری پوری وقعت دیتے ہیں۔ لیکن فنِ حدیث کی ان کمزوریوں کی بنا پر جن کا ذکر کیا ہے ہم اس امر کا التزام نہیں کر سکتے کہ محض علمِ روایت کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات ہی پر پورا پورا اعتماد کریں اور ہر اس حدیث کو ضرور ہی حدیث رسول تسلیم کریں جسے اس علم کی رُو سے صحیح قرار دیا گیا ہو۔ آپ ہماری اس رائے سے اتفاق نہ کریں جس طرح ہم آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے لیکن اس اختلاف رائے کا نتیجہ یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ آپ ہم پر اس جرم کا الزام لگائیں جو فی الواقع ہم نے نہیں کیا ہے۔